Negotiations 5:1 (Jun. 2025) pp. 189-199 **ISSN: 2789-293X**

گیان چند جین بطور ماہرِ لسانیات

Gyan Chand Jain as a Linguist

Surraya Parveen
M.Phil Scholar, Department of Urdu, Superior Unversity, Faisalabad.
suriyaparveen081@gmail.com
Dr. Mubashar Saeed Bajwa
Assistan Professor, Daprtment of Urdu, Superior Unversity, Faisalabad.
mubasharsaeed550@gmail.com

KEYWORDS

Gyan Chan Jain
Urud Linguistics
Historical Linguistics
Urdu Hindi Controversy
Linguistice History of Urdu
Indian Linguistics
Intellectual Journey

DATES

Received	**10-05-2025**
Accepted	**14-06-2025**
Published	**30-06-2025**

QR CODE

ABSTRACT

This article presents a comprehensive analysis of Professor Gyan Chand Jain's pivotal contributions to the field of Urdu linguistics, tracing his intellectual journey from a literary researcher to a pioneering linguist. Motivated by the lack of scientific linguistic curricula in Urdu academia compared to Hindi, Jain equipped himself with formal training in phonetics at summer schools in Sagar and Dharwad. The study critically examines his major linguistic works, specifically Lisani Mutale (1973) and Aam Lisaniyat (1985), highlighting his scientific approach to Urdu phonetics, morphology, and script analysis. Central to his linguistic framework was the theory that Urdu and Hindi are structurally identical, both stemming from Khari Boli, differing only in script and vocabulary a view he supported with evidence from classical shared literature. The article also addresses the significant ideological shift in his final years, culminating in the controversial publication Ek Bhasha: Do Likhavat, Do Adab (2006). This work, written during his struggle with Parkinson's disease and cancer, sparked intense debate regarding the socio-political history of Urdu and its script, leading to allegations of bias and communalism from contemporary scholars like Mirza Khalil Baig. Despite these controversies, the article concludes that Jain's rigorous research methodology and foundational texts remain indispensable to the study of Urdu linguistics.

https://journals.mehkaa.com/index.php/negotiations/article/view/163

تلخیص:

"یہ مقالہ پروفیسر گیان چند جین کی اردو لسانیات کے شعبے میں فیصلہ کن علمی خدمات کا جامع جائزہ پیش کرتا ہے اور ایک ادبی محقق سے جدید لسانیات کے بانیوں میں شمار ہونے تک ان کے فکری سفر کا احاطہ کرتا ہے۔ اردو علمی دنیا میں سائنسی لسانیاتی نصاب کی کمی خصوصاً ہندی کے مقابلے میں ان کے لیے محرک ثابت ہوئی جس کے تحت انہوں نے ساگر اور دھارواڑ کی گرمیوں کی لسانیاتی ورکشاپس میں صوتیات کی باضابطہ تربیت حاصل کی۔ ان کی اہم لسانیاتی تصانیف، بالخصوص، لسانی مطالعات (1973) اور عام لسانیات (1985) کا تنقیدی جائزہ لیتا ہے جن میں انہوں نے اردو صوتیات، صرفیات اور رسم الخط کے تجزیے میں سائنسی طریقِ کار اپنایا۔ ان کے لسانی نظریے کا مرکزی نکتہ یہ تھا کہ اردو اور ہندی ساخت کے اعتبار سے یکساں زبانیں ہیں، دونوں کھڑی بولی سے نکلی ہیں اور ان میں بنیادی فرق صرف رسم الخط اور ذخیرۂ الفاظ کا ہے جس کے حق میں انہوں نے قدیم مشترکہ ادبی روایت سے دلائل فراہم کیے۔ مقالہ ان کے آخری دور کے نمایاں فکری تغیرات پر بھی روشنی ڈالتا ہے، جو ان کی بحث انگیز کتاب ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب (2006) پر منتج ہوئے۔ یہ کتاب انہوں نے پارکنسن اور کینسر جیسی بیماریوں سے لڑتے ہوئے تحریر کی۔ اس نے اردو کے سماجی و سیاسی پس منظر اور رسم الخط کے تاریخی مباحث کو از سرِ نو چھیڑا، جس پر میرزا خلیل بیگ جیسے معاصر ناقدین نے جانبداری اور فرقہ واریت کے الزامات بھی عائد کیے۔ ان اختلافات اور تنازعات کے باوجود مقالہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ جین کی تحقیقی دیانت، مضبوط علمی طریقِ کار، اور ان کی بنیادی لسانیاتی کتب آج بھی اردو لسانیات کے مطالعے میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

گیان چند جین کا لسانیاتی سفر محض ایک اتفاقی حادثہ نہیں تھا، بلکہ یہ ایک شعوری جستجو اور علمی پیاس کا نتیجہ تھا جس کی جڑیں ان کے خاندانی پس منظر اور الہ آباد یونیورسٹی کے علمی ماحول میں پیوست تھیں۔ اگرچہ ان کے والد اردو زبان سے ناواقف تھے، لیکن ان کے پردادا حکیم پدم سین فارسی کے شیدائی اور اردو کے شاعر تھے، اور یہی ادبی ذوق ان کے بڑے بھائی ڈاکٹر پرکاش مونس اور پھر گیان چند جین میں منتقل ہوا۔ الہ آباد یونیورسٹی میں دورانِ تعلیم ڈاکٹر سید اعجاز حسین اور پروفیسر احتشام حسین جیسی قد آور شخصیات کی صحبت نے ان کے ادبی شعور کو جلا بخشی۔ بالخصوص ڈاکٹر سید اعجاز حسین کی تربیت نے ان کے ذہن کو تحقیق کی جانب مائل کیا، جس کا اعتراف انہوں نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"آج جب میں اپنے محترم استاد کے بارے میں کچھ سپرد قلم کرنے چلا ہوں تو مجھے خیال آتا ہے کہ وہ استاد جس نے مجھے سب سے زیادہ مدت تک پڑھایا یعنی مسلسل چار سال وہ صرف مخدومی اعجاز صاحب کی ذات گرامی ہے۔ کسی بھی درس گاہ کے استاد نے مجھے اتنے عرصہ تک فیض یاب نہیں کیا۔"(1)

گیان چند جین کے لسانیاتی سفر کا باقاعدہ آغاز اور محرک 1956ء میں حمیدیہ کالج، بھوپال میں ان کی تعیناتی بنی۔ جب وہاں اردو کا شعبہ قائم ہوا اور نصاب مرتب کیا گیا تو اس میں لسانیات کا ایک پرچہ بھی شامل تھا۔ اس وقت عملی دشواری یہ پیش آئی کہ طلبہ کے لیے اردو میں لسانیات پر کوئی معیاری اور جدید نصابی کتاب دستیاب نہیں تھی۔ اس وقت تک طلبہ منشی احمد دین کی "سرگزشتِ الفاظ" اور وحید الدین سلیم کی "وضعِ اصطلاحات" پر انحصار کرتے تھے، جو جدید لسانی تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر تھیں۔ دوسری جانب جب جین صاحب نے ہندی کے نصاب کا جائزہ لیا تو دیکھا کہ وہاں لسانیات کا ایک معیاری نصاب موجود ہے اور ڈاکٹر بھولا ناتھ تیواری کی کتاب "بھاشا وگیان" پڑھائی جا رہی ہے۔ وکرم یونیورسٹی اور حمیدیہ کالج میں اردو کے امور کے ذمہ دار ہونے کی حیثیت سے انہوں نے تہیہ کیا کہ اردو لسانیات کے پرچے کو ہندی کے معیار کے برابر لایا جائے اور اس خلا کو پُر کرنے کے لیے خود قلم اٹھایا جائے۔

اسی دوران ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ان کے ارادوں میں تلاطم پیدا کر دیا۔ 1956ء میں جب وہ کتاب لکھنے کا ارادہ کر چکے تھے، تو ایک روز ریڈیو پر اردو کی نئی کتابوں پر تبصرہ سنتے ہوئے انہیں معلوم ہوا کہ پروفیسر عبد القادر سروری کی کتاب "زبان اور علم زبان" شائع ہو چکی ہے۔ اس خبر نے ان پر گہرا اثر ڈالا اور انہیں محسوس ہوا کہ جس میدان میں وہ قدم رکھنا چاہتے تھے، وہاں کوئی اور بازی لے گیا ہے۔ تاہم، جب انہوں نے سروری صاحب کی کتاب کو اپنے نصاب میں شامل کیا اور پڑھایا تو انہیں احساس ہوا کہ تشنگی اب بھی باقی ہے اور موضوع کا حق ادا نہیں ہوا۔ مزید برآں، انہیں یہ شدت سے احساس ہوا کہ "صوتیات (Phonetics)" جیسا خشک اور تکنیکی موضوع محض کتابیں پڑھ کر نہیں سمجھا جا سکتا۔ یہی وہ محرک تھا جس نے انہیں باقاعدہ فنی تربیت حاصل کرنے پر اکسایا۔ اس کیفیت اور تربیت کے حصول کے مراحل کو وہ خود یوں بیان کرتے ہیں:

"جب اس کے ابواب کی شرح کی گئی تو مجھ پر بجلی سی گر پڑی معلوم ہوا کہ زمینداران زمینوں کو پہلے ہی اُٹھا چکے ہیں۔ میں نے اپنا ارادہ موقوف کر دیا۔۔۔ (بعد ازاں) ایسا محسوس ہوا کہ اردو مجھ سے مطالبہ کر رہی ہے کہ اس موضوع پر ایک سیر حاصل کتاب لکھوں۔ میں نے لبیک کہا لیکن صوتیات ایسی بلا تھی جو کتاب سے پڑھنے سے پلے ہی نہ پڑتی تھی۔ اس کے متعارف ہونے کے لیے میں نے 1961ء میں ساگر میں منعقدہ گرمائی اسکول لسانیات میں حاضری دی۔ صوتیات کی شدبد ہوئی تو ہوس ہوئی کہ مارفالوجی اور نحو بھی باقاعدہ پڑھا جائے تو بہتر ہے۔ 1962ء میں کرناٹک یونیورسٹی دھارواڑ میں منعقدہ اسکول لسانیات میں اگلا سبق پڑھا۔ لسانیات کے جو مسائل ذہن میں ابھرتے تھے ان پر اساتذہ سے تبادلہ خیال کیا اور پھر بسم اللہ کہہ کر کتاب کا آغاز کر دیا۔"(2)

اس طرح یہ بات واضح ہوتی ہے کہ گیان چند جین کا ماہرِ لسانیات بننا محض روایتی تعلیم کا نتیجہ نہیں تھا، بلکہ یہ بھوپال میں نصابی ضروریات کے احساس، ہندی کے مقابلے میں اردو کو کم مایہ نہ دیکھنے کی خواہش اور صوتیات جیسے ادق موضوع پر عبور حاصل کرنے کے لیے ساگر اور دھارواڑ کے سمر اسکولوں میں کی گئی ان کی عملی اور تکنیکی ریاضت کا ثمر تھا۔ یہی وہ پس منظر تھا جس نے آگے چل کر انہیں "لسانی مطالعے" اور "عام لسانیات" جیسی اہم کتابیں تحریر کرنے کے قابل بنایا۔

پروفیسر گیان چند جین کی تحقیقی کاوشوں میں ان کی پہلی لسانی تصنیف "لسانی مطالعے" (1973ء) ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ سولہ ابواب پر محیط یہ کتاب محض مضامین کا مجموعہ نہیں بلکہ اردو میں سائنسی لسانیات کے اطلاق کی ایک سنجیدہ کوشش ہے۔ اس کتاب میں جین صاحب نے صوتیات (Phonetics) کو زبان کی تفہیم کے لیے کلیدی اہمیت دی ہے۔ ان کا استدلال ہے کہ الفاظ دراصل آوازوں کے مجموعے ہیں جنہیں رسم الخط کا لباس پہنایا جاتا ہے، لہٰذا کسی بھی زبان کے درست رسم الخط کی تشکیل یا اصلاح صوتیات کی نگرانی کے بغیر ممکن نہیں۔ وہ صوتیات کی افادیت کو صرف ادبی دائرے تک محدود نہیں سمجھتے بلکہ اسے ان زبانوں کے لیے بھی ناگزیر قرار دیتے ہیں جو ابھی تک تحریری شکل سے محروم ہیں۔ ان کے نزدیک ماہرِ صوتیات کا کام صرف موجود زبانوں کا تجزیہ نہیں بلکہ بے زبان تہذیبوں کو آواز اور شکل دینا بھی ہے:

> "صوتیات کا ایک اور مفید کام یہ ہے کہ جن زبانوں کے پاس اپنا رسم الخط نہیں ہے۔ ان کی آوازوں کا تجزیہ کرے اور اسے ایک رسم الخط دے۔ اگر اسے کسی دوسری زبان کا خط دیا جائے تو اس میں حسب ضرورت ترمیم واضافہ کرے۔ قبائلی زبانوں میں تحریر کا رواج نہیں ہوتا۔ ماہرین صوتیات ان زبانوں کو سیکھ کر اور آوازوں کی صحیح صحیح تفریق کر کے ان کے لیے رسم تحریر فراہم کرتے ہیں۔ اس طرح ان زبانوں کا عوامی ادب قلم بند کر کے محفوظ کر لیا جاتا ہے۔" (3)

اس کتاب کا ایک اور اہم اور فنی پہلو اردو کے مصوتوں (Vowels) کی تحقیق ہے۔ گیان چند جین نے روایتی لسانی تصورات سے ہٹ کر آوازوں کا باریک بینی سے جائزہ لیا۔ بالخصوص اردو کے دو اہم مصوتوں 'اے' اور 'او' کی نوعیت کے بارے میں پائے جانے والے اختلاف کو انہوں نے تجرباتی انداز میں حل کرنے کی کوشش کی۔ عام طور پر یہ بحث موجود تھی کہ آیا یہ جڑواں مصوتے (Diphthongs) ہیں یا واحد مصوتے (Monophthongs)۔ جین صاحب نے صوتیات کے اصولوں پر ان آوازوں کو پرکھا اور ثابت کیا کہ ان کی ادائیگی کے دوران اعضائے نطق کی حالت تبدیل نہیں ہوتی، لہٰذا یہ واحد مصوتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کا یہ فنی تجزیہ قابلِ غور ہے:

> "جڑواں مصوتے کا تلفظ کرتے وقت اعضائے نطق ایک مصوتے کا تلفظ کرتے ہیں اور پھسل کر دوسرے مصوتا پر پہنچ جاتے ہیں۔ اس طرح دونوں آوازیں ایک ہی کوشش اور ایک ہی جھٹکے میں ادا کی جاتی ہیں۔ جڑواں مصوتے کا تلفظ اگر دیر تک جاری رکھا جائے تو پہلے مصوتے کی آواز ابتدا ہی میں ختم ہو

جائے گی اور آخری مصوتا جاری رہے گا۔۔۔ اس طرح یہ طے ہو جاتا ہے کہ اے اور او واحد مصوتیں ہیں۔" (4)

رسم الخط کے حوالے سے گیان چند جین کا نقطہ نظر "لسانی مطالعے" میں دور خی دکھائی دیتا ہے۔ ایک جانب تو وہ ہندوستان کے قدیم رسم الخط (براہمی وغیرہ) کو سراہتے ہوئے اسے "رسوم الخط کی جنت" قرار دیتے ہیں اور اس کی وسعت کا اعتراف کرتے ہیں، لیکن دوسری جانب اردو رسم الخط کے حوالے سے ان کا رویہ خاصا ناقدانہ ہے۔ "مشترکہ رسم خط" کے عنوان سے شامل باب میں انہوں نے اردو رسم الخط کی فنی کمزوریوں کی نشاندہی کی۔ ان کا ماننا تھا کہ اردو خط میں ایک آواز کے لیے متعدد حروف اور مصوتوں (اعراب) کے عدم اظہار کی وجہ سے پڑھنے میں دشواری پیش آتی ہے۔ ان کے مطابق یہ ایک ایسا ناقص نظام ہے جو قاری سے پہلے سے علم کا تقاضا کرتا ہے:

"پڑھنے کے لیے یہ خط خاصا ناقص ہے۔ یہاں ایک ایک آواز کے لیے کئی کئی حرف ہیں اور بیشتر مصوتوں کے لیے کوئی حرف نہیں۔ حرفوں کے نہایت مختصر اجزا کو ملا کر ایک جالکھنے سے گڈمڈ ہو جانے کا کافی امکان ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں اردو رسم خط میں جو لکھا جائے وہ اسی صورت میں صحیح پڑھا جا سکتا ہے۔ جب کہ ہم پہلے سے اس لفظ کے تلفظ اور مفہوم کو جانتے ہوں۔"(5)

اس کتاب سے متعلق عبدالرشید اپنی رائے یوں پیش کرتے ہیں:

"کتاب کے مضامین عام لسانی بحث سے گزرتے ہوئے اردو۔ ہندی بولی اور زبان اور اس کے منبع و مخرج تک پہنچتے ہیں اور زبان کی علامتوں پر تفصیلی بحث کرتے ہیں۔"(6)

پروفیسر گیان چند جین کی ضخیم تصنیف "عام لسانیات" (1985ء) اردو زبان کے لسانیاتی ادب میں ایک انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے۔ نو سو سے زائد صفحات اور چوبیس ابواب پر محیط یہ کتاب محض نظریاتی بحثوں تک محدود نہیں، بلکہ اس میں اردو زبان کے صرفی، نحوی اور صوتی سرمایے کا ایک منظم اور سائنسی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے ذریعے مصنف نے اردو کے ارتقائی سفر کو عہدِ قدیم سے لے کر عصرِ حاضر تک ایک مسلسل تاریخی عمل کے طور پر دیکھا ہے۔ کتاب کا ایک بڑا حصہ زبانوں کی ساختیاتی درجہ بندی اور خاندانوں کے شجروں پر مبنی ہے، جہاں جین صاحب نے الفاظ کے اخذ و اشتقاق اور جملوں کی بناوٹ کی بنیاد پر اردو کا رشتہ ہند آریائی لسانی خاندان سے جوڑا ہے۔ انہوں نے ہندوستان میں رائج قدیم زبانوں کے لسانی بہاؤ کو دو الگ دھاروں میں تقسیم کیا: ایک سنسکرت اور دوسری پالی و پراکرت۔ ان کے نزدیک اردو کا خمیر اسی دوسری عوامی دھارے سے اٹھا ہے، جس کا تجزیہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"پراکرتیں پالی سے مماثل ہیں لیکن بعض امور میں ان سے مختلف ہیں۔ سنسکرت کی طرح اس کے بھی کئی دور ہیں لیکن سنسکرت کے مقابلے میں کسی قدر تحلیل ہونے لگی ہیں۔ فعل کے روپ اور اسم کی حالتیں کم ہوتی جا رہی ہیں۔ نئے پراکرت کے علاوہ اور کسی پراکرت میں تثنیہ کا صیغہ نہیں ملتا۔ الفاظ عموماً مصمتوں پر ختم نہیں ہوتے۔ تشدید کا رجحان جو پالی میں شدید تھا پراکرت میں بھی ہے لیکن آخری دور میں بہت کم ہو جاتا ہے۔ ان کی جگہ معکوسی مستعمل ہے۔" (7)

اس کتاب کا دوسرا اہم پہلو اردو زبان کی داخلی تاریخ اور اس کے ناموں کے ارتقا کی تحقیق ہے۔ گیان چند جین نے تاریخی شواہد سے یہ ثابت کیا کہ اردو کے تشکیلی دور میں جب یہ ابھی ایک معیاری تحریری زبان کا درجہ حاصل نہیں کر پائی تھی، تو اسے "زبانِ ہندوستان"، "ہندوی"، "دہلوی"، "گجری"، "دکنی" اور "ریختہ" جیسے مختلف ناموں سے پکارا گیا۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ یہ نام محض لیبل نہیں تھے بلکہ زبان کے جغرافیائی سفر اور ادبی ارتقا کے مختلف پڑاؤ تھے۔ خاص طور پر انہوں نے اردو میں 'معکوسی آوازوں (Retroflex Sounds)' کے تاریخی ارتقا، سترہویں صدی کی صوتی خصوصیات اور ہریانی زبان کے ساتھ اردو کے لسانی رشتوں کو انتہائی باریک بینی سے اجاگر کیا ہے۔ اس تحقیق میں انہوں نے ادب کو لسانیات کا سب سے بڑا ماخذ قرار دیا ہے، کیونکہ زبان کا حقیقی روپ ادبی شاہکاروں ہی میں محفوظ ہوتا ہے:

> "ادب سے لسانیات کا اتنا گہرا تعلق ہے کہ شرح کرنے کی ضرورت نہیں۔ لسانیات سے ادب کو اور دوسری زبانوں سے مستعار لفظوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ لسانیات کے لیے ادب مسالہ فراہم کرتا ہے۔ زبان کا تاریخی مطالعہ عہد بہ عہد کے ادبی نمونوں ہی کے سہارے ہو سکتا ہے۔"(8)

"عام لسانیات" میں گیان چند جین کا اندازِ تحریر محققانہ ہونے کے ساتھ ساتھ تدریسی بھی ہے۔ انہوں نے جس طرح اردو کے قدیم رسم الخط کے ارتقا اور سرمایہ الفاظ کا جائزہ لیا ہے، وہ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ وہ اردو کو کسی الگ تھلگ جزیرے کی زبان نہیں بلکہ صدیوں پرانے لسانی تعامل کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ اگرچہ بعض مقامات پر تفصیلات کی کثرت قاری کے لیے دشواری کا باعث بنتی ہے، لیکن اردو کی لسانی ساخت، اس کے فعل و اسم کے تغیرات اور قدیم پراکرتوں سے اس کے روابط کو جس طرح اس کتاب میں دستاویزی شکل دی گئی ہے، وہ اسے اردو لسانیات کی تاریخ میں ایک ناگزیر حوالے کی کتاب بنا دیتی ہے۔

پروفیسر گیان چند جین کے لسانی تصورات کا سب سے بنیادی اور کلیدی نکتہ اردو اور ہندی کے مابین ایک اٹوٹ لسانی رشتے کا اقرار ہے۔ وہ روایتی اردو محققین کے اس نظریے سے انحراف کرتے ہیں کہ اردو ایک جداگانہ اور مستقل زبان ہے، بلکہ ان کے نزدیک لسانیاتی اعتبار سے اردو اور ہندی ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں جن کی بنیاد "کھڑی بولی" پر استوار ہے۔ ان کا استدلال ہے کہ صرف رسم الخط یا ذخیرہ الفاظ کے فرق سے کسی زبان کی ہیئت تبدیل نہیں ہو جاتی۔ وہ اردو کو ہندی کا ہی ایک اسلوب (Style/Shaili) قرار دیتے ہیں اور ہندی کو اردو کا۔ اس نظریے کی تقویت کے لیے وہ کلاسیکی ادب سے "رانی کیتکی کی کہانی"، "سنگھاسن بتیسی" اور "بیتال پچیسی" جیسی مثالیں پیش کرتے ہیں، جو دونوں زبانوں کے ادبی سرمایے میں مشترک ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ یہ کتابیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ عوامی سطح پر اور بنیادی ڈھانچے کے لحاظ سے یہ زبانیں کبھی الگ نہیں تھیں، بلکہ ان میں پوری کی پوری کتب مشترک ہیں اور ان میں لسانی مغایرت نہیں پائی جاتی۔

گیان چند جین اردو کے آغاز کے بارے میں جو نظریہ پیش کرتے ہیں، وہ اسے مسلمانوں کی آمد یا لشکر کی پیداوار قرار دینے کے بجائے مقامی ہند آریائی ارتقا سے جوڑتے ہیں۔ ان کے مطابق اردو کو مسلمان اپنے ساتھ نہیں لائے تھے اور نہ ہی یہ کوئی "ملغوبہ"

زبان ہے، بلکہ اس کا خمیر یہیں کی مٹی سے اٹھا ہے۔ وہ جدید ہندی کی تشکیل کے بارے میں اس عام تاثر کو بھی رد کرتے ہیں کہ اس کا آغاز انیسویں صدی میں فورٹ ولیم کالج کی کوششوں اور سنسکرت الفاظ کی شمولیت سے ہوا، بلکہ وہ اسے ایک قدیم تر تسلسل کا حصہ سمجھتے ہیں۔ تاہم، وہ اردو کی تشکیل کو دو مختلف تاریخی ادوار میں تقسیم کرتے ہیں؛ پہلا دور زبان کی بنیادی تشکیل کا ہے اور دوسرا دور اس میں عربی و فارسی الفاظ کے نفوذ کا، جس نے اسے موجودہ 'اردو' کی شکل دی۔ اس تاریخی اور لسانی تقسیم کو وہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> "اصل یہ ہے کہ اُردو کے آغاز کی دو منزل ہیں اول جدید ہند آریائی زبانوں میں کھڑی بولی، جو گیارہویں بارہویں صدی میں نمودار ہوئی ہو گی۔ دوسرے کھڑی بولی کے اُردو روپ کی نشو نما جو بعد کا کارنامہ ہے۔"(9)

جین صاحب کے اس تجزیے کا حاصل یہ ہے کہ جسے ہم آج اردو کہتے ہیں، وہ دراصل کھڑی بولی کا ہی وہ ارتقائی روپ ہے جس میں عربی اور فارسی کے الفاظ شامل ہو گئے۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ہندی کی شیلی اردو ہے اور اردو کی شیلی ہندی ہے، اور کھڑی بولی ان دونوں کی مشترکہ ماں ہے۔ ان کے نزدیک زبان کا ڈھانچہ (نحو اور صرف) ہی زبان کی اصل شناخت ہوتا ہے، اور چونکہ اردو اور ہندی کا یہ ڈھانچہ یکساں ہے، لہٰذا انہیں دو الگ زبانیں سمجھنا لسانیاتی اعتبار سے درست نہیں۔ اسی بنا پر وہ اس زبان کی ابتدائی تاریخ میں ہندی، ہندوی اور اردو کی اصطلاحات کو ایک ہی لسانی وجود کے مختلف ناموں کے طور پر دیکھتے ہیں، جس پر بعد میں تہذیبی اور مذہبی شناختوں کے غلاف چڑھا دیے گئے۔

پروفیسر گیان چند جین کی علمی زندگی کا آخری باب ایک شدید فکری تبدیلی اور لسانیاتی انحراف سے عبارت ہے، جس کا اظہار ان کی آخری تصنیف "ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب" (2006ء) میں ہوا۔ یہ کتاب ان کے سابقہ معروضی اور سائنسی اندازِ نظر کے برعکس ایک جذباتی اور یک طرفہ رد عمل کی صورت میں سامنے آئی، جسے ادبی حلقوں میں ان کی عمر بھر کی کمائی کو داؤ پر لگانے کے مترادف سمجھا گیا۔ اس کتاب کی تصنیف کے پسِ پردہ امرت رائے کی کتاب "اے ہاؤس ڈیوائیڈڈ" کے اثرات کارفرما تھے، جہاں جین صاحب نے لسانی تاریخ کو ایک مخصوص سیاسی اور مذہبی عینک سے دیکھنے کی کوشش کی۔ انہوں نے یہ نظریہ قائم کرنے کی سعی کی کہ تاریخ میں فاتح قوموں (بالخصوص مسلمانوں) کا یہ وتیرہ رہا ہے کہ وہ مقامی زبانوں اور رسم الخط کو مسخ کر کے اپنا تسلط قائم کریں۔ اس کتاب میں شامل ان کے بعض بیانات نے اردو دنیا میں ایک بھونچال پیدا کر دیا، جس میں وہ لکھتے ہیں:

> "امرت رائے نے کہاں کہاں سے دریافت کر کے بیسویں صدی عیسوی کے ربع اول و دوم کے لکھنے والوں کی ایسی تحریروں کے اقتباس دیے ہیں کہ تاریخ میں مسلمانوں کی یہ پالیسی رہی ہے کہ جن علاقوں کو فتح کیا جائے وہاں کی زبان بالخصوص رسم الخط کو ختم کر کے اپنی زبان اور لپی (رسم الخط) کو ان پر مسلط کیا جائے۔"(10)

اس کتاب کی اشاعت نے علمی دنیا کو دو واضح گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک طرف وہ طبقہ تھا جس نے اسے "وشو ہندو پریشد اور آر ایس ایس کا منشور" قرار دیا، تو دوسری طرف کچھ لوگ اسے مصنف کے داخلی کرب کا نتیجہ سمجھتے رہے۔ جین صاحب نے اس کتاب میں ان مسلمہ تاریخی حقائق سے انحراف کیا کہ جدید ہندی کی تشکیل فورٹ ولیم کالج کے زیر اثر ہوئی، بلکہ انہوں نے اردو رسم الخط اور مسلمانوں کی علیحدگی پسند تحریکوں کو ہندی کے بگاڑ کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ ان کے اس رویے پر شدید ردعمل سامنے آیا اور ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ نے جواب میں "ایک بھاشا جو مسترد کر دی گئی" لکھ کر ان کے اعتراضات کا مدلل رد کیا۔ جین صاحب کی اس فکری کایا پلٹ کو اردو کے محققین نے تعصب اور تنگ نظری سے تعبیر کیا، جس کا اظہار مرزا خلیل بیگ نے یوں کیا:

> "زیر مطالعہ کتاب اُردو کے عالم و فاضل گیان چند جین کی نہیں بلکہ کسی تنگ نظر اور متعصب ذہن کے فرقہ پرست جو ہندی پرست بھی ہے، کی لکھی ہوئی کتاب معلوم ہوتی ہے۔"(11)

اس تنازعے کی نفسیاتی توجیہ کرتے ہوئے بعض مبصرین کا خیال ہے کہ یہ کتاب دراصل گیان چند جین کے لاشعور میں چھپے ہوئے اس احساسِ مظلومیت کا شاخسانہ تھی جو اردو کے ہندو ادیبوں میں کبھی کبھی ابھر آتا ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں، جب وہ امریکہ میں مقیم تھے اور مختلف بیماریوں سے نبرد آزما تھے، اس کتاب کو اپنے دل کا غبار نکالنے کا ذریعہ بنایا۔ ان کے اس رویے کو ابرار رحمانی نے "کتھارسس (Catharsis)" کی ایک شدید ضرورت قرار دیا، جس نے بالآخر ان کی علمی ساکھ کو متاثر کیا۔ اس نفسیاتی کیفیت کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا گیا ہے:

> "گیان چند جین کے ذہن و دماغ میں اُردو کے دیگر ہندو ادیبوں کی طرح اپنے مظلوم ہونے کا احساس ہمیشہ جاگزیں رہا۔ دراصل انہیں کتھارسس کی ضرورت تھی۔ اور اگر ہندوستان میں رہتے ہوئے وہ ایک بار کتھارسس کے عمل سے گزر جاتے یا ان کے دوست احباب اور بہی خواہ انہیں کسی طرح کتھارسس کے اس عمل سے مختلف صحبتوں اور گفتگو میں گزار دیتے تو شاید اس کتاب کے لکھنے کی نوبت ہی نہ آتی۔"(12)

پروفیسر گیان چند جین کا اسلوبِ تحقیق محض روایتی اصولوں کی پاسداری کا نام نہیں تھا، بلکہ یہ ایک مسلسل ارتقائی عمل اور دیانت دارانہ اعترافِ حقیقت سے عبارت تھا۔ ان کی تحقیقی زندگی میں ایک ایسا موڑ بھی آیا جب انہوں نے اپنی تدریسی خامیوں کا برملا اعتراف کیا، جو ایک بڑے عالم کی عاجزی اور سچائی کی دلیل ہے۔ وہ تحقیق کو محض معلومات کا انبار لگانے کے بجائے ایک منظم فکری عمل سمجھتے تھے، لیکن وہ اس بات کو تسلیم کرنے میں بھی نہیں ہچکچاتے تھے کہ ابتدائی دور میں وہ خود اصولِ تحقیق کے فنی تقاضوں سے مکمل طور پر آگاہ نہیں تھے۔ جموں یونیورسٹی کے ڈاکٹر ظہور الدین کے حوالے سے ایک واقعے کا ذکر کرتے ہوئے، جس میں ان کے شاگرد نے شکایت کی تھی کہ جین صاحب نے دورانِ نگرانی تحقیق کے طریقے نہیں سکھائے، گیان چند جین نے انتہائی کشادہ دلی سے اپنی پوزیشن واضح کی:

"سنا ہے کہ کسی اعتراض کے جواب میں انہوں نے سیمینار میں کہا کہ میں نے ان کی ریسرچ کے دوران میں انہیں تحقیق کے طریقے نہیں بتائے تھے۔ ان کا کہنا درست تھا، میں اس زمانے میں اصول تحقیق سے بہت کچھ واقفیت حاصل کر چکا تھا لیکن وہ میرے ذہن میں ترتیب شدہ شکل میں نہیں تھے چنانچہ میں اپنے زیر نگرانی اسکالروں کو صریحاً درس نہیں دیتا تھا۔" (13)

معاصرین کے ساتھ گیان چند جین کے تعلقات، بالخصوص فراق گورکھپوری جیسی نابغہ روزگار مگر پیچیدہ شخصیت کے ساتھ، ان کے مشاہداتی شعور اور بیباک اسلوب کی عکاسی کرتے ہیں۔ وہ شخصیات کو دیومالائی ہالے میں دیکھنے کے بجائے انہیں گوشت پوست کے انسان کے طور پر دیکھتے اور پیش کرتے تھے۔ فراق صاحب کی شاعری کے مداح ہونے کے باوجود وہ ان کی نجی زندگی کی بے اعتدالیوں اور فکری تعصبات کو قلم بند کرنے سے نہیں چوکتے تھے۔ انہوں نے فراق کی اقبال دشمنی اور ان کے عجیب و غریب حلیے (نیم برہنگی) کو کسی مصلحت کے بغیر بیان کیا۔ جب فراق نے اقبال کے خلاف سخت جملے استعمال کیے اور انہیں "بینگن کا ٹھیلا ڈھکیلنے والا" کہا، تو جین صاحب نے ایک محقق کی حیثیت سے "دروغِ مصلحت آمیز" پر "راستیِ فتنہ انگیز" کو ترجیح دی۔ اپنے اس سوانحی اور تحقیقی رویے کی وضاحت وہ یوں کرتے ہیں:

"میں نے اس ملاقات کی تفصیل اور مندرجہ بالا جملے ایک لمبے تامل کے بعد لکھے ہیں۔ فراق پرست مجھ پر ان کی کردار کشی کا الزام لگائیں گے۔۔۔ لیکن ذوق تحقیق نے مجھے حقیقت کا ایسا شیدائی بنا دیا ہے کہ میں دروغ مصلحت آمیز پر راستی فتنہ انگیز کو ترجیح دینے لگا ہوں۔ اس کے علاوہ میرا ایمان ہے کہ ہر بڑے ادیب کی شخصیت کو پورے کا پورا صحیح صحیح پیش کرنا چاہیے۔ اس کی شخصیت کا کوئی گوشہ چھپانا نہیں چاہیے۔"(14)

گیان چند جین کی مجموعی خدمات کا احاطہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ انہوں نے اردو لسانیات کو جو محمود شیرانی اور محی الدین قادری زور کے بعد جمود کا شکار تھی، ایک نئی سائنسی جہت عطا کی۔ انہوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام انتہائی تکلیف دہ بیماریوں (پارکنسن اور کینسر) میں گزارے، لیکن علم کی شمع کو بجھنے نہیں دیا۔ امریکہ کے دیارِ غیر میں، 2002ء کے آس پاس، جب وہ شدید علیل تھے، تب بھی وہ اپنی آخری کتاب کے مسودے اور گلکرسٹ کے لغات کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ ان کی علمی لگن کا اندازہ صابر ارشاد عثمانی کو لکھے گئے ایک خط سے ہوتا ہے، جس میں انہوں نے اپنی حالتِ زار اور کام کی تڑپ کو بیک وقت بیان کیا:

"میں نے اردو ہندی کے تعلق سے ایک مختصر کتاب لکھی ہے۔ آج کل اس کا مسودہ تیار کر رہا ہوں۔۔۔ آپ کی ذاتی معلومات کے لیے لکھتا ہوں کہ میں تین امراض میں مبتلا ہوں: 1۔ بڑھا ہوا Parkinson۔ 2۔ دماغ کے نچلے حصے میں ایک گٹھلی یا پھوڑا۔ 3۔ پروسٹیٹ غدود کا کینسر۔ میں نے طے کیا ہوا ہے کہ کینسر کا علاج نہ کرواؤں گا۔"(15)

مختصر یہ کہ گیان چند جین کی ذات نے اردو دنیا کو "لسانی مطالعے" اور "عام لسانیات" جیسی گراں قدر کتابیں دیں جو آج بھی حوالہ جاتی حیثیت رکھتی ہیں۔ اگرچہ ان کا اختتام ایک متنازعہ کتاب اور اردو کمیونٹی سے دوری کی صورت میں ہوا، لیکن بحیثیت ماہرِ لسانیات ان کے کام کی وسعت، ان کی عرق ریزی اور اردو زبان کی ساخت و ارتقا پر ان کی گہری نظر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اردو لسانیات کی تاریخ کا ایک ایسا باب ہیں جن کے بغیر اس موضوع کا مطالعہ ادھورا رہے گا۔

گیان چند جین کی لسانی خدمات کے مطالعے کی روشنی میں اہم سفارشات درج ذیل ہیں:

گیان چند جین کی آخری متنازعہ کتاب "ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب" کو بنیاد بنا کر ان کی پوری زندگی کی علمی ریاضت کو مسترد نہیں کرنا چاہیے۔ محققین اور طلبہ کو چاہیے کہ وہ ان کی ابتدائی کتابوں ("لسانی مطالعے" اور "عام لسانیات") کو ان کے آخری دور کے جذباتی ردعمل سے الگ کر کے پڑھیں، تاکہ اردو صوتیات اور ساخت پر ان کے قیمتی سائنسی کام سے استفادہ کیا جا سکے۔

چونکہ "عام لسانیات" اردو میں لسانیات کے موضوع پر ایک انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے، اس لیے اسے یونیورسٹیوں کے ایم اے اور پی ایچ ڈی کے نصاب میں بنیادی حوالے کی کتاب کے طور پر شامل کیا جانا چاہیے۔ بالخصوص صوتیات، مورفولوجی (صرف) اور ہند آریائی زبانوں کے تقابلی جائزے کے لیے ان کی تحقیقات کو جدید لسانی اصولوں کے ساتھ پڑھایا جانا ضروری ہے۔

گیان چند جین کے اس نظریے پر کہ "اردو اور ہندی لسانی اعتبار سے ایک ہی ہیں (کھڑی بولی)"، مزید غیر جذباتی اور معروضی تحقیق کی ضرورت ہے۔ ان کے پیش کردہ دلائل (جیسے مشترکہ کلاسیکی داستانیں اور نحوی ساخت) کا جدید لسانیات کی روشنی میں از سرِ نو جائزہ لیا جانا چاہیے تاکہ دونوں زبانوں کے لسانی رشتوں کی حقیقت سیاسی تعصبات سے ہٹ کر واضح ہو سکے۔

حوالہ جات

1. صابر ارشاد عثمانی، گیان چند جین، مشمولہ: نئی کتاب شمارہ 5 (نئی دہلی: نئی کتاب پبلشرز، اپریل جون 2008ء)، 121۔
2. گیان چند جین، عام لسانیات (نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، 1985ء)، 13۔
3. گیان چند جین، لسانی مطالعے (دہلی: نیشنل بک ٹرسٹ، 1979ء)، 19۔
4. ایضاً، 55۔
5. ایضاً، 155۔
6. عبدالرشید (مبصر)، لسانی مطالعے، مشمولہ: ماہنامہ اردو دنیا، نئی دہلی، نومبر 2011ء، 65۔
7. گیان چند جین، عام لسانیات، 853۔

8. ایضاً، 883۔
9. گیان چند جین، لسانی مطالعے، 152۔
10. ابرار شاد عثمانی، گیان چند جین، مشمولہ: نئی کتاب، شمارہ 5، نئی کتاب پبلشرز، نئی دہلی، 2008ء، ص 125-126۔
11. مرزا، خلیل احمد بیگ، ایک بھاشا جو مسترد کر دی گئی (نئی دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2007ء)، 21۔
12. ابرار رحمانی، گیان چند جین: رکھ لی میرے خدا نے۔۔، مشمولہ: رسالہ عالمی اردو ادب، دہلی، اکتوبر 2008ء، 300۔
13. صابر ارشاد عثمانی، گیان چند جین، مشمولہ: نئی کتاب شمارہ 5، (نئی دہلی: نئی کتاب پبلشرز، 2008ء)، 122۔
14. ایضاً، 123-124۔
15. ایضاً، 125۔

References in Roman Script

1. Sabir Irshad Usmani, Gyan Chand Jain, Mashmoola: Nai Kitab, Shumara 5, (Nai Dilli, Nai Kitab Publishers, April–June 2008), 121.
2. Gyan Chand Jain, Aam Lasaniyat, (Nai, Dilli, Taraqqi Urdu Bureau, 1985), 13.
3. Gyan Chand Jain, *Lasani Mutalay* (Dilli: National Book Trust, 1979), 19.
4. Ibid, 55.
5. Ibdi, 155.
6. Abdul Rasheed (Mubsir), Lasani Mutalay, Mashmoola: (Nai Dilli: Mahanama Urdu Dunya, Nai Dilli, November 2011), 65.
7. Gyan Chand Jain, Aam Lasaniyat, 853.
8. Ibid, 883.
9. Gyan Chand Jain, Lasani Mutalay, 152.
10. Abr Irshad Usmani, Gyan Chand Jain, Mashmoola: Nai Kitab, Shumara 5 (Nai Dilli: Nai Kitab Publishers, 2008), 125–126.
11. Mirza Khalil Ahmad Baig, Aik Bhasha Jo Mustarad Kar Di Gayi (Nai Dilli: Educational Publishing House, 2007), 21.
12. Abrar Rehmani, Gyan Chand Jain: Rakh Li Mere Khuda Ne..., Mashmoola: Risala Aalmi Urdu Adab, Dilli, October 2008, 300.
13. Sabir Irshad Usmani, Gyan Chand Jain, Mashmoola: Nai Kitab Shumara 5 (Nai Dilli, Nai Kitab Publishers, 2008), 122.
14. Ibid, 123–124.
15. Ibid, 125.